آج کا دن (۲۱؍اپریل) پاکستان کیلئے بڑا اہم ہے کہ قانون اور عوام کی حکومت کا سورج طلوع ہوا

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۱؍اپریل ۱۹۷۲ء بمقام مسجد مبارک۔ ربوہ)

تشہّد وتعوّذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور انور نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:-

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۷﴾ (اٰل عمران: ۲۷)

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ (اٰل عمران: ۱۶۰)

پھر حضور انور نے فرمایا:-

''آج کا دن پاکستان کی زندگی میں ایک بڑی ہی تاریخی اہمیت کا دن ہے۔ ایک لمبے عرصہ کی لاقانونیت کے بعد آج قانون کی حکومت شروع ہوئی اور عوام کی حکومت کا سورج طلوع ہوا ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ۔

پاکستان کو قائم ہوئے قریباً پچیس سال ہونے کو ہیں۔ اس عرصہ میں بڑی ہی تلخیاں نظر آتی ہیں۔ ایک حسّاس دل ان تلخیوں کو ابھی بھولا نہیں۔ خدا کرے کہ ان تلخیوں کے بھلانے اور ان زخموں پر مرہم لگنے کے سامان پیدا ہو جائیں۔

بہرحال یہ زمانہ ایک مذہبی جماعت کی حیثیت میں ہمارے لئے بھی اور ہمارے ان

سب بھائیوں کے لئے بھی جنہیں دُنیا عوام کہتی ہے اور جن کو غریب سمجھتے ہوئے اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس دیکھتے ہوئے دھتکار رہی تھی، تلخیوں کا زمانہ تھا۔ اس عرصہ میں اس ساری حسین تعلیم کو جو اسلام نے انسان کو دی اور جسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُنیا میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ پسِ پشت ڈال دیا گیا۔

میں اس وقت گزشتہ پچیس سالہ مختلف حکومتوں کا جو دور ہے، اس میں ان کا کیا کردار رہا۔ اس کا تجزیہ تو نہیں کرنا چاہتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ کسی وقت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ماضی کے حالات کا بھی، حالیہ واقعات کا بھی اور مستقبل کی اُمیدوں کا بھی تجزیہ کروں گا۔ لیکن ایک بات بڑی واضح ہے اس کا ذکر میں اس وقت کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جو بالغ اور ادھیڑ عمر کی سنجیدہ نسل تھی اُس نے بڑی قربانیاں دیں تب جا کر پاکستان کا قیام عمل میں آیا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس نسل کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں حکومت کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اس کے برعکس ایک نسل تو وہ تھی جو تقسیم ملک کے وقت بچے تھے یعنی جو ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور دوسری وہ جو اُس وقت جوانی کے ابتدائی دور یعنی ۲۱ اور ۲۵ سال کی درمیانی عمر کے تھے۔ اب ان میں سے جو بچے تھے وہ تو ناسمجھ تھے اور جو ابھی ابھی بالغ ہوئے تھے وہ ناتجربہ کار تھے۔ اس لئے حکومت کا انتظام لازماً اُن لوگوں کے سپرد ہوا جو ذرا بڑی عمر کے تھے یعنی ۳۰۔۳۵ سال سے اوپر کے تھے۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ بظاہر کم تجربہ کار اور کچھ زیادہ تجربہ کار تھے اور بڑے سنجیدہ تھے اور ایک وقت میں بڑی قربانیاں دینے والے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ اس نسل کو دُنیوی لحاظ سے حقیقی طور پر حاکم نہیں بنانا چاہتا تھا چنانچہ اس عرصہ میں ظلم کا ایک چکر چلتا رہا۔ کسی حکمران نے بعض باتوں میں لوگوں کا کچھ خیال رکھا اور بعض لحاظ سے ظلم روا رکھے۔ کسی نے بعض اور پہلوؤں کا کچھ خیال رکھا اور ساتھ ہی ظلم بھی کرتا رہا۔ ہم کسی کو پورے طور پر بُرا نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس دُنیا میں کسی کو پورے طور پر برا کہہ دینا نہ درست ہے نہ معقول ہے اور نہ مناسب ہی ہے۔ اس لئے گذشتہ دور کی مختلف حکومتیں کلی طور پر بُری نہیں کہلائی جاسکتیں لیکن کسی صورت اچھی بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کیونکہ

جہاں تک میں نے غور کیا ہے اُن کے بُرے کام اُن کے اچھے کاموں سے زیادہ ہیں۔ ہم بُرے کام کو بُرا اور اچھے کام کو اچھا کہیں گے کیونکہ قرآن کریم نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شراب کی ممانعت فرمائی مگر ساتھ ہی فرمایا شراب جیسی چیز کو بھی تم کلیۃً بُرا نہ کہو کیونکہ یہ بھی اپنی ذات میں پورے اور کلی طور پر بُری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرۃ:۲۲۰)

فرمایا: اس میں گندگی اور گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لئے بھلائی کے سامان بھی ہیں دُنیوی لحاظ سے ہم بہت ساری چیزوں کی PRESERVATION (پری زرویشن) یعنی قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں۔ غرض اس سے بہت سے مفید کام لئے جاتے ہیں مگر جہاں تک کسی آدمی کے شراب کے استعمال کا تعلق ہے اِس میں برائیاں زیادہ ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس کا پینا منع کر دیا ہے۔

اس میں دراصل ہمارے لئے ایک اصول قائم کر دیا گیا ہے کہ WHOLE SALE CONDEMNATION (ہول سیل کنڈیمنیشن) یعنی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ چیز کے متعلق یہ کہہ دینا کہ اس میں برائی ہی برائی ہے، یہ اصولاً غلط ہے کسی چیز میں جو برائیاں ہیں وہ چند خاص اور غلط زاویوں سے پیدا ہوتی ہیں اور جو خوبی ہے وہ صحیح زاویہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر چیز کا مجموعی جائزہ لینے اور اُسے چاروں طرف سے دیکھنے کے بعد ہی اُس کی اچھائی یا بُرائی کا حکم لگانا چاہئے۔ یہ بھی ایک مستقل مضمون ہے اور بیان کرنے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی دی اور توفیق بخشی تو کسی وقت اسے بھی انشاء اللہ بیان کروں گا۔

بہرحال پچھلے ۲۵ سال میں جن حکومتوں کا دور دورہ رہا اُن میں ہمیں بظاہر برائیاں زیادہ اور خوبیاں کم نظر آتی ہیں۔ وہ اس ملک کے حقیقتاً حاکم نہیں تھے۔ ان کی حکومتوں کا نظام صرف پاکستان کو زندہ اور قائم رکھنے کے لئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے علم میں ایک وقت ایسا آنے والا تھا جب پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتا۔ چنانچہ اس وقت تک پاکستان کی حفاظت بھی کی گئی اور پاکستان میں تلخی پیدا کر

کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی اور اُبھرنے والی نسل کی تربیت بھی کی گئی اور ان کو مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور بھی کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے پہلے دور میں جو پاکستانی شہری تھے ان کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو ۱۹۴۷ء کے بچے، دوسرے ۱۹۴۷ء کے نئے نئے اور ناتجربہ کار نوجوان اور تیسرے ۱۹۴۷ء کے ذرا بڑی عمر کے اور زیادہ بڑی عمر کے لوگ جنہیں تجربہ تو تھا لیکن وہ عملاً قوم کے اندر ترقی کی روح پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

غرض ۱۹۴۷ء میں جو بچہ تھا وہ اس وقت جوان ہو چکا ہے۔ ۲۳، ۲۴ سال کی عمر کا ہو گیا ہے اور جو اُس وقت ۲۵ سال کے لگ بھگ تھے وہ اس وقت ۴۸، ۴۹ سال کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ شاید دو تہائی سے بھی زیادہ ہیں یعنی جو ۱۹۴۷ء میں بچے تھے اور اب جوان ہو چکے ہیں اور دوسرے جو اُس وقت بالکل ناتجربہ کار نوجوان تھے اور اب ادھیڑ عمر کے قریب پہنچ گئے ہیں ان ہر دو گروہوں کے متعلق خدا کی شان یہ نظر آتی ہے کہ اس پچیس سالہ دور میں ان کو حکومت میں کوئی دخل نہیں ملا۔ بلکہ حکومت کی باگ ڈور زیادہ تر ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو اس وقت پچاس سال سے زیادہ عمر کے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک حصہ تو بہت اچھا رہا۔ مگر دوسرا حصہ ملک کی تباہی اور قوم کی ہلاکت کا باعث بنا البتہ اس گروہ کو بھی ہم کلیۃً بُرا نہیں کہہ سکتے ان میں بعض بڑے اچھے لوگ بھی تھے لیکن خرابی یہ تھی کہ ان کی بات بھی ٹھیک طرح مانی نہیں جاتی تھی کیونکہ ڈکٹیٹر شپ یعنی مارشل لاء کا زمانہ تھا یا پھر COMPROMISE (کمپرومائز) کا زمانہ تھا۔ اس کمپرومائز یعنی سیاسی طور پر باہمی سمجھوتے کی یہ صورت بن جاتی ہے کہ باہمی سمجھوتہ کر لو۔ اپنی بعض اچھی چیزیں چھوڑ دو اور دوسرے کی بُری چیزیں لے لو۔ غرض پچھلے پچیس سالہ دور میں یہی دو خرابیاں کارفرما رہیں۔

بہرحال اس وقت پہلی دفعہ ایک نیا گروہ اُبھرا ہے جو دراصل دو گروہوں پر مشتمل ہے جن میں سے پہلا گروہ ۴۷ء اور کچھ عرصہ بعد میں پیدا ہونے والے بچے ہیں یعنی وہ بچے جو ۵۱۔۵۰ء تک پیدا ہوئے اور اب وہ ۲۱ اور ۲۴ سال کی درمیانی عمر کے ہو چکے ہیں (اور ۲۱ سال کی عمر میں انہیں اپنی رائے دینے کا حق بھی مل چکا ہے) اور دوسرے وہ لوگ جو تقسیم ملک

کے وقت ۲۴، ۲۵ سال کے تھے اور اب ۴۹۔۵۰ سال کے ہو گئے ہیں ان دونوں گروہوں کو اب تک حکومت میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص تقدیر چل رہی تھی کہ انہیں حکومت میں کوئی حصہ نہ ملے تاہم ان کو جس چیز میں حصہ ملا وہ تھا ''سیاست بازی'' اور ''سیاسی جوڑ توڑ'' کو دیکھنا، ان کا مشاہدہ کرنا اور ان کو PERCIEVE (پرسیو) یعنی محسوس کرنا اور پھر اپنے دماغ میں سوچنا کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنا اور اس نتیجہ پر پہنچ کر کسی خاص قسم کے عمل کے لئے تیار ہو جانا۔ یعنی ایک طالب علم جو تربیت حاصل کر رہا تھا، جو فراست حاصل کر رہا تھا، جو علم حاصل کر رہا تھا جو علم سے نتائج نکال رہا تھا اور جس کے دل میں ایک خواہش اور امنگ پیدا ہو رہی تھی کہ ملک میں ہونا تو یوں چاہئے لیکن ہو کچھ اور رہا ہے۔

چنانچہ پچھلے الیکشن پر ملکی آبادی کے اس حصے کو پہلی دفعہ اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا جس میں اس نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ ہمارے ملک کی ہر سیاسی پارٹی کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل تھی۔ اس طرف کسی کو خیال ہی نہیں گیا کہ اس الیکشن کا نتیجہ کن لوگوں کے ووٹوں کی اکثریت سے نکلے گا۔ بس وہ اپنے پرانے اربعے لگا رہے تھے اور خود ہی اپنے دل میں فیصلے کر رہے تھے کہ یہ نتیجہ نکلے گا وہ نتیجہ نکلے گا۔

مجھے کسی آدمی نے بتایا ہے واللہ اعلم یہ صحیح ہے یا غلط کیونکہ میرے پاس تو ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ میں حکومت کو ملنے والی رپورٹوں کے متعلق یہ کہہ سکوں کہ واقعی ایسی رپورٹ کی گئی تھی تاہم یہ بات مشہور ہے کہ گذشتہ انتخابات سے معاً پہلے پنجاب کے متعلق حکومت کی انٹیلی جینس کی رپورٹ یہ تھی کہ دولتانہ صاحب کو پنجاب سے قومی اسمبلی کی ۲۵۔۲۶ نشستیں ملیں گی۔ جماعت اسلامی کو ۱۳، ۱۴ نشستیں ملیں گی اور پیپلز پارٹی کو ۷۔۸ نشستیں ملیں گی وغیرہ۔ اس طرح اُنہوں نے پنجاب کی جو کہ غالباً ۸۲ نشستیں ہیں ان کا تجزیہ کیا ہوا تھا۔

جب انتخابات سے شاید ایک دن پہلے کسی نے مجھے یہ بتایا کہ یہ ان کا آخری تجزیہ ہے تو میں نے کہا نہ سیاستدانوں کو کچھ پتہ ہے اور نہ یہ جو حکومت کے کان اور آنکھیں ہیں (پولیس و انٹیلی جینس) اُنہوں نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ دراصل وہ اس حصے یا ان دو گروہوں کو جن کے ووٹوں کی اکثریت تھی اور جنہوں نے اس موقع پر فیصلہ کُن کردار ادا کرنا تھا، بھول گئے تھے مگر

اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھ عطا فرمائی ہے۔ ہمارے مستعد غیر متعصب اور نہایت اچھی تربیت پانیوالے نوجوانوں نے اس موقع پر بڑی سمجھ کے ساتھ کام کئے ہیں۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ بات کرنے کے بعد ہر حلقہ انتخاب کے متعلق اپنی ایک رائے بھجواتے تھے اور اُنہوں نے یہ سلسلہ انتخابات سے کوئی ایک مہینہ پہلے سے شروع کر رکھا تھا۔ مثلاً کسی حلقۂ انتخاب میں ۴۰ فیصد آراء ہیں یا اپنی برادری کے لحاظ سے اتنے لوگ ہیں یا اتنے ڈاکٹر ہیں یا اتنے محنت کش ہیں۔ اسی نسبت سے وہ ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ تمہاری رائے کدھر ہے؟ چنانچہ ہر ایک گروہ کی آراء معلوم کرنے کے بعد وہ ہمیں رپورٹ بھجوا دیتے تھے۔ چنانچہ جہاں حکومت کے کان اور آنکھوں نے یہ رپورٹ کی تھی کہ پیپلز پارٹی کو پنجاب سے قومی اسمبلی میں ۷۔۸ نشستیں ملیں گی وہاں ہمارے نوجوانوں نے جن کو سیاسی تجربہ بھی کوئی نہیں تھا کیونکہ ہم ایک مذہبی جماعت ہیں ہم نے سیاست کی طرف کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ ہم تو اپنے نوجوانوں کو بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن پڑھو، حدیثیں پڑھو، نمازیں پڑھو اور دعائیں کرو اپنے لئے بھی، ملک کے لئے بھی اور سب سے زیادہ غلبۂ اسلام کے لئے، اور بداخلاقی میں نہ پڑو۔ مغربیت کا اثر نہ لو وغیرہ، غرض ہمارے نوجوانوں کو تو اس قسم کی دینی تربیت دی جاتی ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فراست عطا فرمائی اور مستعدی بخشی تھی اس لئے ان کی آخری رپورٹ یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کو پنجاب سے قومی اسمبلی میں ۶۲ نشستیں ملیں گی چنانچہ انتخابات میں واقعی اُنہوں نے ۶۲ نشستیں لیں ایک کی غلطی بھی نہیں ہوئی چنانچہ مجھے کسی نے بتایا کہ خود پیپلز پارٹی کے بعض لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ دُنیا میں اندازے ہوا ہی کرتے ہیں لیکن ایک کی بھی غلطی نہ ہو اور جو ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمارا یہ انداز ہے اسی کے مطابق نشستیں مل جائیں بڑی حیران کُن بات ہے۔ یہ بات ان کے لئے واقعی حیران کُن ہے کیونکہ ہماری جماعت کے باہر جو نوجوان ہیں جن لوگوں کو ان کی تربیت کرنی چاہئے وہ بدقسمتی سے ان کی تربیت کا کما حقہٗ انتظام نہیں کر سکے یا جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ ان کی تربیت کی جائے یعنی کوئی تعصب نہ ہو اور عقل و سمجھ سے کام لیا جائے۔ اس طرح وہ ان کی تربیت نہیں کر پاتے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے اندر بھی تعصب راہ پا جاتا ہے حالانکہ تعصب انسانی

دماغ کو خراب اور عقل کو مار دیتا ہے۔

بہرحال جو چیز میں بتا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ ان دو گروہوں کے ووٹوں نے فیصلہ کرنا تھا۔ ان میں سے ایک وہ گروہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں آگے پیچھے پیدا ہوا۔ یعنی اس وقت بچے تھے یا تھوڑے سال بعد پیدا ہوئے اور دوسرا وہ گروہ ہے جو اس زمانے میں سیاسی بلوغت کی عمر کو پہنچ رہے تھے۔ یعنی ۲۱ سال کی عمر کو پہنچنے پر ووٹ دینے کا حق مل رہا تھا اور ان دونوں گروہوں کی ۱۹۴۷ء میں بھی بہرحال اکثریت تھی اور چونکہ نسل تو ویسے ہی بڑھ رہی ہے۔ اس لحاظ سے اب بھی اکثریت ہے۔ (آپ خود سوچیں اس کی تفصیل میں مَیں اس وقت نہیں جاتا دیر ہو جائے گی) اور ۱۹۴۷ء میں جو لوگ چالیس، پچاس سال سے زائد عمر کے لوگ تھے، ان کو خدا تعالیٰ نے یہ موقعہ نہیں دیا کہ وہ پاکستان کو صحیح راہوں پر چلا سکیں۔ البتہ ان کو یہ موقع ضرور دیا گیا کہ وہ پاکستان کو ہلاکت سے بچا سکیں اور پھر آخر میں تو اُنہوں نے اس موقع کو بھی ضائع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ملک کا ایک حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور یہ اس گروہ کی دراصل بڑی ہی ناکامی ہے کہ وہ آدھا پاکستان ہم سے کٹ گیا ہے۔

پس یہ تو پچھلے پچیس سال کی سیاست کے متعلق ایک بنیادی بات ہے جسے میں نے مختصراً بیان کر دیا ہے۔ پاکستان کی اس اکثریت یعنی ان دو گروہوں نے جو اکثریت میں ہیں اور جو یا تو اس وقت نوجوان ہیں اور یا ۱۹۴۷ء سے نوجوان اور عملی تجربہ حاصل کرتے ہوئے اب ۵۰ سال کے لگ بھگ ان کی عمر ہے دراصل انہوں نے ہی فیصلہ کیا ہے یعنی یہ ساری شکل جو اب ہمیں نظر آ رہی ہے کہ فلاں پارٹی کی اتنی طاقت ہے اور فلاں پارٹی کی اتنی، اس میں بڑا حصہ ان دونوں گروہوں کا ہے جنہیں پہلی دفعہ اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا ہے۔

پس جہاں ہمارے لئے یہ امر انتہائی دُکھ دہ ہے کہ مشرقی پاکستان عارضی طور پر ہم سے جدا ہو گیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لے یہ خوشی کا سامان پیدا کر دیا ہے کہ لاقانونیت اور مارشل لاء کا دور ختم ہوا اور قانون اور عوامی حکومت کا دور شروع ہو گیا ہے۔

''عوامی جمہوریہ'' دراصل مشاورت کے اصول پر قائم ہوتی ہے اسلام کا بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ باہم مشورہ کے ساتھ حکومت کا نظم و نسق چلانا ہے چنانچہ یہ مسئلہ تو طے ہو گیا ہے اس

وقت میں جماعت کو اس امر کے متعلق توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ان کی دعا کرنے کی ذمہ داری ہے، جماعت کو اس طرف بھی متوجہ رہنا چاہئے۔ دراصل جہاں تک مشورہ کا تعلق تھا وہ لیجسلیچر یعنی منتخب نمائندوں کی اسمبلی (جسے زیادہ تر ان ووٹوں نے منتخب کیا ہے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے) قائم ہوگئی، مارشل لاء ختم ہوگیا۔ اب اُنہوں نے سوچنا بھی ہے، مشورے بھی کرنے ہیں۔ مشورے تو ہوں گے لیکن دُنیا کا کام محض مشوروں سے کامیابی تک نہیں پہنچتا۔

پس مشورہ کے علاوہ دو اور چیزوں کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ فلاح و کامیابی کے لئے ایک تو عزم اور دوسرے توکّل کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی مشورہ عزم پر منتج نہ ہو یعنی اگر لوگ ویسے ہی باتیں بنائیں اور دھواں دھار تقریریں کریں اور پھر منتشر ہو جائیں تو یہ لایعنی مشورہ ہے، مشورہ اگر صحیح راہ پر ہے تو اسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے عزم کا ہونا ضروری ہے ورنہ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور عزم کے کامیاب ہونے کے لئے توکّل ضروری ہے جس کے بغیر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

پس مجلس مشاورت یعنی لیجسلیچر کے سامان تو پیدا ہو گئے لیکن اگر ہمارے ملک اور ہماری قوم نے ترقی کرنی ہے اور دُنیا میں عزت کا کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے ازبس ضروری ہے کہ مشاورت یعنی لیجسلیچر کے مشوروں کے بعد صحیح عزم اور صحیح توکّل پیدا ہو۔ اس کے لئے ہمیں دعا کرنی چاہئے۔

عزم کے دو معنے ہیں۔ ایک پختہ ارادہ کرنے کے یعنی اپنے دل میں یہ عہد کر لینا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ جو پختہ ارادہ کیا گیا ہے اس پر سنجیدگی کے ساتھ اور اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ عمل کرنا۔ غرض یہ ہر دو قسم کا مفہوم عزم کے معنوں کے اندر شامل ہے اور پختہ ارادہ جس پر سنجیدگی اور پوری صحت اور طاقت سے عمل کیا جائے اس کو عربی زبان میں ''عزم'' کہتے ہیں۔

پس موجودہ لیجسلیچر نے جو فیصلے کئے ہیں ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ پختہ ارادہ کی ہے یعنی ایک خاص معاملہ کے متعلق فیصلہ ہو گیا لیکن عزم کا جو دوسرا بنیادی اور اہم حصہ ہے یعنی پوری سنجیدگی کے ساتھ اور ساری طاقت کے ساتھ اپنے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنا کر نیک

نتائج تک پہنچا دینا، یہ لیجسلیچر یعنی مُقَنّنہ کا کام نہیں ہے، یہ انتظامیہ یعنی حکومت کا کام ہے مثلاً اب ان حالات میں یہ صدر بھٹو کا کام ہے، یہ اُن کے وزراء کا کام ہے، یہ اُن کے مشیروں کا کام ہے، یہ صوبوں کے گورنروں کا کام ہے یا اُن کے وزراء کا کام ہے۔ غرض لیجسلیچر کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانا (لیجسلیچر کے باہر) حکومت کا کام ہے۔

پس مرکزی لیجسلیچر نے فیصلہ کر دیا ہے اور یہ عزم کا ایک حصہ ہے کہ پختہ عزم کر لیا کہ ہم نے یوں کرنا ہے لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا اور پوری ہمت اور کوشش سے کامیاب کرنا یہ عزم کا دوسرا حصہ ہے جس کا تعلق ایگزیکٹو سے ہے یعنی موجودہ شکل میں صدر مملکت اور ان کے وزراء یا حکومت کی دوسری مشینری یعنی کل پرزے جو ہیں یہ اُن کا کام ہے۔

جہاں تک انتظامیہ کی کارکردگی کا تعلق ہے اس میں دو برائیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن سے بچنے کے لئے ہمیں دعائیں کرنی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو ان سے محفوظ رکھے۔ ایک برائی یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ جو عزم کا عملی حصہ ہے یعنی پختہ ارادہ کو پوری سنجیدگی اور ساری طاقت کے ساتھ عملی جامہ پہنانا اس میں کوئی کمزوری نہ پیدا ہو جائے مثلاً ہماری لیجسلیچر یعنی مقنّنہ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ بس فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں چنانچہ عزم کے اس عملی حصے کی طرف جب پوری سنجیدگی کے ساتھ اور پورے طور پر توجہ نہیں دی جاتی تو اس میں ایک بنیادی نقص پیدا ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے دل کا ارادہ ناکام ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی بھی دلی ارادہ اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ حسنِ عمل نہ ہو۔

عزم کے عملی حصے میں دوسری خرابی یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ مثلاً انسان کسی کام کے متعلق یہ پختہ ارادہ کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کر کے چھوڑنا ہے۔ میں اس کے لئے توجہ بھی دوں گا۔ میرے پاس اس کی تکمیل کے لئے بڑے بڑے سامان موجود ہیں۔ غرض وہ اپنے دل میں کہتا ہے میں یہ کروں گا میں وہ کروں گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا خانہ خالی رہ جاتا ہے حالانکہ انسانی عزم کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ پر توکّل بھی بڑا ضروری ہے۔ انسان جب بھی کسی کام کا عزم کرے تو اُسے چاہئے کہ وہ اپنی طاقت یا اپنے علم یا اپنی خواہش یا اپنے بلند ارادے یا اپنے سامانوں

پر بھروسہ نہ کرے بلکہ عاجزانہ راہوں کو اختیار کرتے ہوئے محض خدا تعالیٰ اور اس کی صفات پر توکّل رکھے اور اس کی طاقتوں پر تکیہ کرے۔ اگر کوئی آدمی ایسا نہیں کرتا تو شیطان اس کے ارادوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔

پس عزم کے عملی پہلوؤں میں ایک تو کوئی کمزوری نہیں آنی چاہئے۔ یعنی نہ سنجیدگی سے کام کرنے کے لحاظ سے کمزوری پیدا ہو اور نہ پوری طاقت کے استعمال میں کمزوری پیدا ہو کیونکہ ''آدھی پچدھی'' طاقت خرچ کر دینے سے کوئی کام پورا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنی قوت بازو سے اپنے ارادوں کو کامیاب بنا دیں گے۔ ہمارے ارادے خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ہماری نیتیں خواہ کتنی ہی نیک کیوں نہ ہوں اگر اس ارادے یا نیت نے اللہ تعالیٰ کے دامن کو نہیں تھاما اور اسے مضبوطی کے ساتھ نہیں پکڑا تو پھر کامیابی ممکن نہیں۔

پس جماعت کو یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے۔ ہمارے وہ مظلوم، غریب اور مستحق بھائی جن کے حقوق کی ادائیگی کے سامان پیدا ہونے کا امکان ہمیں اُفق سیاست پر نظر آ رہا ہے اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ میسر آ جائیں یعنی مشاورت کے بعد صحیح عزم کا ہونا پھر عزم کے دونوں پہلوؤں کا پایا جانا۔ پھر عزم یعنی پختہ ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تکبر اور غرور کا پیدا نہ ہونا یعنی اپنے نفس پر، یا اپنی فراست پر یا اپنے علم پر یا اپنے تجربہ پر یا اپنی استطاعت پر یا اپنی دولت پر بھروسہ اور تکیہ نہ کرنا بلکہ محض اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی کامیابی عطا ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے مظلوم بھائیوں کی خاطر ہماری موجودہ حکومت کو یہ سامان میسر آئیں اور خدا کرے کہ ہمارے غریب اور مظلوم بھائیوں کے اندھیروں کے دن حقیقتاً ختم ہو جائیں۔ یہ محض زبانی نعرے نہ ہوں کہ ظلمت دور ہوگئی اور نور آ گیا بلکہ ہر گھر میں اس نور سے اُجالا ہو جائے۔ اسلام نے ہر انسان کے جو حقوق قائم کئے ہیں خدا کرے ان حقوق کی شمعیں ہر گھر میں روشن ہو جائیں اور ہمارے ملک میں خوشحالی و خوش بختی اور روشنی و روشن خیالی کے سامان پیدا ہو جائیں اور ہر ایک آدمی کو اپنی ذمہ داریوں کے کما حقہ نباہنے کی توفیق ملتی رہے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۱۴؍مئی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲ تا ۴)